ڈاکٹر حامد خان حامد

مولانا محمد علی جوہر

غیروں اور اپنوں کی نظر میں

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما (حافظ)

متحدہ ہندوستان میں، جن لوگوں نے تحریکِ آزادی، نہضتِ خلافت، اتحادِ مسلمین یا پان اسلام ازم (Pan Islamism) اور حصولِ آزادی وغیرہ میں حصہ لیا اور بین المللی شہرت و عزت حاصل کی، ان میں جو حضرات بالخصوص منصۂ شہود پر آئے وہ علی برادران تھے۔ یعنی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی۔

علی برادران میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور ذوالفقار علی خاں کا ذکر اکثر کتبِ تاریخ میں جلی اور روشن حروف میں کیا گیا ہے۔ ذوالفقار علی خاں احمدیہ فرقے کے زیرِ اثر آگئے اور تاسیسِ پاکستان کے بعد لاہور میں انتقال کر گئے۔ مولانا شوکت علی نے قدم قدم پر اپنے چھوٹے بھائی مولانا محمد علی جوہر کی مدد کی اور ان کے مقاصد کو عملی جامہ پہنانے میں کسی قسم کی کوتاہی یا سہل انگاری کا اظہار نہیں کیا۔ محمد علی کی وفات کے بعد شوکت علی کو ایک اور محمد علی مل گئے جو قیامِ پاکستان کی تاریخ میں محمد علی جناح کے نام سے موسوم ہیں اور جنھوں نے پاکستان بنا کر تحریکِ آزادی کے ہر مسلمان رہبر کے خوابوں اور کوششوں کو تشکل اور تحقق بخش دیا۔

مولانا محمد علی جوہر ۱۸۷۸ء کی تحریکِ آزادی کے بڑھتے ہوئے رجحانات اور میلانات میں ۱۰ دسمبر ۱۸۷۸ء کو روہیل کھنڈ کے دارالخلافے رام پور میں پیدا ہوئے اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ ان کو ۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو بیت المقدس میں اس جگہ سپردِ خاک کیا گیا، جو اس زمانے میں علما اور فضلا کی تدفین کے لیے مخصوص تھی۔

جوہر کے والدِ محترم دربارِ رام پور کے ممتاز عہدہ دار منصب تھے۔ بیٹے کی ولادت کے کوئی دو سال بعد یعنی ۲۰ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو اس دارِ فانی کو خیرباد کہہ گئے۔ جوہر نے تقریباً بارہ سال کی مدت رام پور میں

گزاری، اس کے بعد ۱۸۹۰ء میں علی گڑھ پہنچ گئے۔ گویا تحصیل و تعلم کے ابتدائی چند سال رام پور میں گزرے اور باقی عرصہ علی گڑھ کے سکول اور کالج میں بسر ہوا۔ اگر آپ علی گڑھ نہ آتے تو شاید دوسرے اہل رام پور کی طرح دربار رام پور کے مصاحبین یا متعلق شعرا وغیرہ میں شامل ہو جاتے اور اس طرح آپ کی زندگی محدود ہو کر رہ جاتی۔

علی گڑھ نے آپ کو انگریز حکام کے ساتھ انہی کی زبان میں بات کرنے کا اسلوب سکھایا۔ لارڈ میکالے نے تو یہ کوشش کی تھی کہ ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو برطانیہ کے کلرکوں کی کاربن کاپی بنایا جائے لیکن سید احمد خان اور مولانا جوہر کا مقصود حیات اور مطمح نظر اس کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ جدید علوم خصوصاً انگریزی کی تحصیل اور تعلم کے ذریعے انگریز حکام کے دوش بدوش کھڑا ہونا چاہتے تھے تاکہ اپنے اور دیگر مسلمانوں کے مافی الضمیر کو احسن طریقے سے ان کے گوش گزار کر سکیں اور ملکہ وکٹوریہ ان کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک نہ کرے۔

مولانا کی زندگی بہت سے ابواب پر مشتمل ہے۔ میں ان سے قطع نظر کر کے ان کی زندگی کے صرف اس پہلو پر روشنی ڈالتا ہوں جس کا تعلق مولانا کے بارے میں اپنوں اور غیروں کے نظریات سے ہے۔ یہ نظریات زیادہ تر اس وقت لوگوں کے سامنے آئے جب مولانا دنیا کو الوداع کہہ چکے تھے۔ مولانا کی زندگی میں بہت سے موڑ آئے۔ ان کو اپنے افکار و خیالات کی وجہ سے قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلنی پڑیں، قدم قدم پر ناکامیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا لیکن ان کے پائے استقامت میں ان سب باتوں کے باوجود کوئی لغزش نہیں آئی۔ انھوں نے "نہ" نہیں "لا" یا "No" کہنا نہیں سیکھا تھا۔ آپ سب کے لیے ہاں، نعم اور Yes سے کام لیتے تھے۔ لیکن جب کوئی ان کے ذاتی مفاد کی بجائے قومی مفاد کو زک یا گزند پہنچانا چاہتا تھا تو اس سے فوراً الگ ہو جاتے تھے۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ گاندھی کے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے لیکن جب ان کو معلوم ہوا کہ گاندھی کے اقدامات میں ملت المسلمین کے لیے سوائے نقصانات کے اور کچھ نہیں تو گاندھی سے قطع تعلق کر لیا۔

ان کی زندگی کا آخری سال بڑی کسمپرسی کا سال تھا۔ سخت بیمار ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں سے کنارہ گیری کی نصیحت کی لیکن وہ باز نہ آئے۔ ان کا جسم ادھ موا ہو چکا تھا، ذیابیطس میں مبتلا ہو گئے تھے، ایک آنکھ ناکارہ ہو گئی تھی، خون کا دباؤ بہت بڑھ چکا تھا۔ دماغ کی رگ

پھٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ اس پر بھی جب جون ۱۹۳۰ء میں گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی تو قبول کرلی اور "رائسرائے آف انڈیا" نامی بحری جہاز میں سوار ہوکر لندن کے لیے روانہ ہوگئے۔ سفر میں ایک ماہ صرف ہوا۔ راستے میں طبیعت بگڑ گئی کچھ دن پیرس میں علاج کیا گیا۔ بہرحال انگلستان پہنچ گئے۔ جب تک وہاں مقیم رہے، ہر قسم کے لوگ ان سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک سب کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آتے تھے اور بلا امتیازِ مقام و منصب ہر ایک کی قدر کرتے تھے۔ جس وقت جہاز ہندوستان سے روانہ ہوا تھا، اس پر کالے جھنڈے نصب کر دیے گئے تھے۔ کالا رنگ ماتم کی علامت ہے۔ محبانِ جوہر کو اندیشہ تھا کہ یہ سفر ان کا سفرِ آخرت ثابت ہوگا۔ سب اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا تھے کہ آپ بخیر و عافیت سفر سے واپس آئیں۔ اس سفر میں ان کو تین قسم کے لوگوں سے مبارزہ کرنا تھا۔ انگریز حکام سے، ہندوؤں سے اور کانفرنس میں شریک ہونے والے وفد کے ان مسلمان ارکان سے جو ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ مختصر یہ کہ ۹ نومبر ۱۹۳۰ء کو گول میز کانفرنس میں دھواں دار تقریر کی اور اسی تقریر کے دوران کہا کہ میں یا تو آزادی کا پروانہ لے کر جاؤں گا یا یہیں مر جاؤں گا، اس طرح کم از کم غلام ملک میں مرنے سے تو بچ جاؤں گا اور ایک آزاد ملک میں مرنا یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ آپ کو آزادی کا پروانہ تو نہ مل سکا لیکن موت کا پیغام آپہنچا۔

آپ کی وفات کے بعد "دی ٹائمز آف لندن" نے ۶ جنوری ۱۹۳۱ء کو لکھا: آپ کی نمازِ جنازہ آپ کے انتقال کے بعد جو اتوار کی صبح، ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو رونما ہوا، ۵ جنوری کو شام کے ۶ بجے ادا کی گئی، وزیرِ اعظم کی نمائندگی کے فرائض ایس۔ کے۔ براؤن نے انجام دیے۔

گول میز کانفرنس کی ذیلی کمیٹی کے صدر لارڈ سانکے (Lord Sankey) نے ۵ جنوری کو کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا: "وہ یعنی محمد علی بڑے ہی محبوب مسلمان رہنما تھے۔ اپنے مطمحِ نظر کے حصول میں ان کی طرف سے جو اقدامات کیے گئے، ان میں انھوں نے کبھی تساہل اور کاہلی کا ثبوت نہیں دیا۔ انھوں نے اپنی تکالیف کا کبھی احساس نہیں کیا اور دمِ واپسیں پر بھی قومی مفادات کو مدِنظر رکھا۔ ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، بالخصوص تحریکِ آزادی کے ایک راہنما کے طور پر اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے۔" یاد رہے کہ مولانا نے علی گڑھ یونیورسٹی سے ستمبر ۱۸۹۸ء میں بی۔ اے میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں آپ دوسرے نمبر پر آئے تھے۔

گویا دوسری پوزیشن سے کامیاب ہوئے تھے۔

لارڈ ریڈنگ نے کہا "میں مولانا محمد علی کو لندن آنے سے پہلے نہیں جانتا تھا لیکن یہاں ان سے مل کر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کی شخصیت میں بڑی عظمت اور جذباتیت ہے۔ وہ گوناگوں بیماریوں میں مبتلا اور برلب گور ہونے کے باوجود اپنے ہم وطنوں، اپنی ملت اور اپنے ساتھیوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے طویل سفر طے کر کے یہاں آئے اور اپنے مشن میں انتقال کر کے شہادت کے مقام پر فائز ہوئے۔"

لارڈ پیل (Lord Peal) نے کہا: "جوہر بڑی صلاحیتوں کے مالک اور بے حد جرأت مند تھے۔ عزائم بلند اور مقاصد ارفع تھے۔ انھوں نے انہی کے حصول میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کر دی۔"

۔ ٹرپکٹن (M. Picklon - Turbeinell) نے کہا: "میں جب مولانا محمد علی سے لندن میں ملا تو ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے نمایاں پہلوؤں سے مجھے آشنا کیا اور بالآخر یہ بتایا کہ میں ایسے عالم میں یہاں آیا ہوں کہ دوبارہ اپنے ہم وطنوں کو نہیں دیکھ سکوں گا اور ایسا ہی ہوا۔ وہ دوبارہ اپنے وطن واپس نہ جا سکے۔ اپنے مقصود اور مطلوب کی تکمیل میں جان بحق ہو گئے۔"

سر تیج بہادر سپرو نے کہا: "تمام ہندوستانیوں کو مولانا محمد علی پر فخر ہے۔ انھوں نے آزادی کے لیے ہر قسم کی مشکلات کا سامنا کیا اور بڑی شجاعت اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا۔ ان کو ہر ہندوستانی ہمیشہ یاد رکھے گا۔"

ہندوستانی اسٹیٹ کے سیکرٹری نے ان کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا: "محمد علی نے ڈاکٹروں کی طرف سے کی گئی ممانعت کے باوجود جدوجہد آزادی میں شرکت کی۔ ہر قسم کے لوگوں کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ وہ ایک عظیم مسلمان، ایک بڑے محبِ وطن اور بزرگ ترجمانِ انسانیت تھے۔"

دی ٹائمز میں ویج ووڈ بین (Wedg wood Benn) نے مولانا کی وفاتِ حسرت آیات اور بیت المقدس تک ان کے جسدِ مردہ کو لے جا کر دفن کرنے کی داستان بڑے ہی رقت آمیز الفاظ میں قلم بند کی ہے۔ پہلے تو خیال یہ تھا کہ ان کی نعش کو بحری جہاز کے ذریعے ہندوستان پہنچا دیا جائے، لیکن جہاز رانوں

کی وہم پرستی اور توہم کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ ادھر عالمِ اسلام کا اصرار یہ تھا کہ ان کو بیت المقدس میں دفن کیا جائے۔ آخر مولانا شوکت علی اور بہت سے سرکردہ لوگ ان کی میّت لے کر بیت المقدس پہنچ گئے۔ شوکت علی نے اپنے بھائی کی میّت کو غسل دینے کی سعادت حاصل کی۔ بیت المقدس تک کا سفر ٹرین کے ذریعے کیا گیا تھا۔

ایک مشہور مصری شاعر شوقی ضائف نے مولانا محمد علی کے عنوان سے ایک طویل نظم عربی میں کہی۔ چند شعر یہ ہیں:

بیتٌ علی ارض الهدیٰ وسمائه — الحق حائطه واُس بنائه
الفتح من أعلامه والطهر من — أوصافه والقدس من اسمائه
هو من سیوف الله جل جلالهٗ — أو من سیوف الهند عند قضائه

۱۔ بیت المقدس ایک پاکیزہ سرزمین میں واقع ہے۔ اس کا آسمان عدل و انصاف کی بنیاد پر قائم ہے۔
۲۔ فتح اس کا علم ہے۔ صفائی اور پاکیزگی اس کی علامت ہے اور تقدس و قدسیت اس کا نام ہے۔
۳۔ آج لوگ اس کی تربت کے گرد جمع ہو گئے ہیں اور فرشتے آسمانی جشن میں شرکت کر رہے ہیں۔

علّامہ اقبال نے پہلے تو جوہر کی قید سے رہائی پہ اظہارِ خیال کیا تھا اور اس کے بعد ان کی وفات پر۔ پہلے وہ چند شعر ملاحظہ ہوں جو قید سے رہائی پہ کہے گئے تھے:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند — قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مشکِ اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے — مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی ہے قدرت مگر — کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند

اسی موضوع پہ فارسی میں فرمایا ہے:

سپہر زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست — این سعادت قسمتِ شہباز و شاہین کردہ اند

مولانا کی وفات پہ بھی علّامہ نے فارسی میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

یک نفس جانِ نزار او تپید اندر فرنگ — تا مژہ بر ہم زنیم از ماہ و پروین درگزشت
ای خوشا مشتِ غبار او کہ در جذبِ حرم — از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گزشت
خاک قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت — سوی گردوں رفت زاں راہی کہ پیغمبر گزشت

می نگنجد جز بہ آن خاکی کہ پاک از رنگ و بوست — بندہ ای کو از تمیز اسود و احمر گذشت
جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشم آسیا ست — گرچہ آن نور نگاہ خاور از خاور گذشت

مولانا ظفر علی خاں ان کی وفات پر بے حد غم گین اور ملول ہوئے۔ اسی عالم میں ایک نظم کہی جس کے چند شعر یہ ہیں:

جس وقت ہو رہی تھی خلافت کی کانٹ چھانٹ — اور دشمنوں کی زد میں درِ دانیال تھا
خیبر سے چل کے تا بہ سوادِ طرابلس — پھیلا ہوا صلیب پرستوں کا جال تھا
مغرب کا عزم تھا کہ عرب پارہ پارہ ہوں — ایرانیوں کی تاک میں دیوِ شمال تھا
برقِ فرنگ کوند رہی تھی حجاز پر — ناموسِ خواجہ دوسرا پائمال تھا
دینا تھا بوسہ قدس نوائے صلیب کو — لتھڑا ہوا لہو میں نشانِ ہلال تھا
ارضِ حرم تھی خونِ مسلماں سے لالہ رنگ — اسلام کا خود اپنے ہی گھر میں یہ حال تھا
اس جاں گسل جہاد میں کیونکر شریک ہوں — ہندوستان کا عقدہ یہی اک سوال تھا
آخر کیا یہ عقدہ محمد علی نے حل — حالانکہ ساری قوم میں قحطِ رجال تھا
محروم تھا اگرچہ وہ تیغ و تفنگ سے — لیکن زبانِ جوہرِ سحرِ حلال تھا
ملت کے احتجاج کی قوت تھی پشت پر — اور آگے آگے اس کے نبی کا جلال تھا
اس لشکر گراں نے نصاریٰ کو دی شکست — ممکن وہ ہو گیا جو اک امرِ محال تھا
ملت کو جس نے فتح مبین کی نوید دی — اسلام کا یہ قاصد فرخندہ فال تھا
ہندو عرب کو جس نے ہم آغوش کر دیا — پیوند قدس ہو کے وہ اس کا وصال تھا

میں اس کے حق میں اس کے سوا اور کیا کہوں
ہندوستاں میں آپ وہ اپنی مثال تھا

یہاں اس امر کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی نے دو پرچے جاری کیے تھے۔ ایک "کامریڈ" جو انگریزی میں تھا، وہ پہلے کلکتے سے اور پھر دہلی سے شائع ہوتا تھا، اور دوسرا "ہمدرد" جو اردو میں تھا اور دہلی سے نکلتا تھا۔ "کامریڈ" کے ذریعے وہ اپنے ہم وطنوں کے افکار و خیالات کو انگریز حکام تک پہنچاتے تھے اور "ہمدرد" کی وساطت سے اپنے اور انگریز حکام کے نظریات عوام

کے گوش گزار کرتے تھے۔ ان کی انگریزی نہایت فصیح و بلیغ تھی بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ انگریزی نثر اردو نثر سے بہتر طریقے سے لکھتے تھے تو غلط نہ ہوگا۔ روزنامہ "دی ٹائمز آف انڈیا" کے ایڈیٹر مسٹر ٹووِل فریزر (Mr. Tovil Fraser) نے جب ان کے مضامین کا وہ سلسلہ دیکھا جو انھوں نے عدم رضایت کے بارے میں افکار و خیالات (Tought on the present Discontent) کے عنوان سے مذکورہ پرچے میں چھپوانا شروع کیا تو یہ کہنے میں تامل نہیں کیا کہ کوئی ہندوستانی آپ کی طرح انگریزی نہیں لکھ سکتا اور شاید بہت کم انگریز اس قابل ہوں گے جو مولانا سے بہتر انگریزی لکھ سکیں۔

مولانا محمد علی تحصیلِ علم کے دوران اکثر علمی و ادبی مسائل پر اپنے استادوں سے بھی الجھ جایا کرتے تھے۔ ان کے اساتذہ میں جو ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ سے وابستہ تھے، بیک (Beck)، موریزن (Morrison) آرنلڈ (Arnold) اور شبلی نعمانی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ ان اساتذہ بالخصوص شبلی کے ان کی ذات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قید کے دوران شاعری کے علاوہ سیرت النبی پر ایک نہایت ضخیم کتاب لکھنے میں مصروف ہو گئے، جو قید سے رہا ہونے کے باعث نامکمل رہ گئی اور جسے بعد میں ان کے ایک شاگرد اور معتقد نے مرتب و مدوّن کیا۔

آخر میں خود جوہر کی اپنی پیش گوئی کا تذکرہ بھی لازم ہے۔ آپ نے اپنی وفات سے قبل کہا تھا:

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر — یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ان کی اولاد میں چار لڑکیاں تھیں، لڑکا کوئی نہ تھا۔ دو آپ کی زندگی ہی میں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ دو ان کے بعد زندہ رہیں۔ ان کی چہیتی بیٹی آمنہ تھیں جن کا انتقال ۱۱ مارچ ۱۹۲۴ء کو ہوا۔ دوسری لڑکی جولائی ۱۹۲۹ء میں فوت ہوئی۔

یہ تھی مختصر سی سرگزشت اس مردِ مومن کی جس نے مجاہدانہ اور مبارزانہ زندگی بسر کی اور بالآخر جامِ شہادت نوش کر کے حیاتِ جاوید حاصل کی:

شریکِ بزم ہیں اب بھی ترے شہیدِ وفا — اگرچہ محفلِ شام و سحر سے گزرے ہیں (حامد)